ڈاکٹر عبدالکریم خالدؔ
وزیٹنگ پروفیسر، اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

فیض اور اکیسویں صدی کا منظر نامہ

Faiz Ahmad Faiz is a metaphor of peace, fraternity and justice against the international forces of oppression, autocracy and exploitation. He was against war but he fought against the exploiting forces who stained their hands with the blood of the oppressed, and continued his struggle through his pen. Peace and liberty was a dream of Faiz. His optimistic tone and belief in the bright future is a symbol of dawn in the dark night. The revolution which Faiz has discussed is just to appear in the form of decline of Capitalism at global level. None is more aware of the basic problems and issues of Pakistan than Faiz. For him, the solution to the problems of Pakistan is only to rescue the people from every kind of oppression and indoctrination.

بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں پہلی عالم گیر جنگ کے نتائج ایک نئی ہنگامہ خیز صورت حال کو جنم دے رہے تھے۔ نئی دریافتوں، ایجادات اور انکشافات نے دنیا کو ایک حیرت سرا کا روپ دے دیا تھا۔ تہذیبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر انسان کی فکر ایک نیا رُخ اختیار کرنے لگی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں اقبال سمیت ایک سے بڑھ کر ایک شخصیت موجود تھی اور اس کے ساتھ ہی نوجوانوں کی وہ نسل بھی، جس نے اپنی تاریخ اور فکری سرمائے پر نئے سرے سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نسل کا امتیاز یہ تھا کہ اس نے انگریزی کے وسیلے سے جدید تعلیم تک رسائی حاصل کر کے فکری حوالوں سے زندگی کا ایک نیا تصوّر پایا تھا۔ فیض اور ان کے ہم عصر نوجوان اِسی نسل کے نمائندہ تھے جس کے جدید ذہن کی فکری بنیاد اپنی روایات کے دائرے میں رہ کر ایک عالمی تصوّر سے وابستہ تھی۔ بقول عزیز حامد مدنی:

> ''فیضؔ کے ذہن نے اپنی تاریخ کے پسِ منظر میں اور اُن اثرات سے جو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی فضا میں مرتّب ہو رہے تھے، ایک نیا رُخ تلاش کیا، ایسی آگہی جو تخلیق کی ذمے داری اُٹھا سکتی ہے۔ الفاظ کی نئی ترتیب، نئے تخیلی نقش، نئے امیج کے ساتھ آتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری ایک نئے ذہن، ایک نئی آگہی کی شاعری ہے جس کی مماثلت دوسری زبانوں کے شعرا کے یہاں ملے گی..... کسی بھی زبان کی شاعری کا رُخ باہر کی طرف نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاشرے سے پیوستہ ہو کر ہی قوت پاتی ہے۔ فیضؔ کا کلام اپنے حسنِ معنی میں اِسی بات کا مظہر ہے۔ اچھے ذہنوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ مماثل ذہن کی آگہی کو اپنے ہی مواد سے پیوستہ کر کے نئے محاورے اور نئے نقش میں منتقل کریں۔''[1]

ہر بڑے شاعر کی طرح فیض کی اوّلین نمود بھی ایک رومانی شاعر کے طور پر ہوئی تاہم اِس رومانویت میں بھی ایک فکری اُفق کی تلاش کا عمل جاری نظر آتا ہے۔ فیضؔ نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ شاعری کے لیے کسی مثبت جدید نظریے کا شعور لازمی ہے۔ چناں چہ نقشِ فریادی کے بعد ''دستِ صبا'' میں یہ شعور پختہ تر ہو کر نمایاں ہوتا ہے جس کے ابتدائیے میں فیض لکھتے ہیں:

''شاعر کا کام محض مشاہدہ نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردوپیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اِسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔۔۔ اور تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔''[۲]

''حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔''[۳]

فیضؔ کی شاعری اس مجاہدے کی روداد بیان کرتی ہے جسے انھوں نے حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کے ادراک کا نام دیا اور شاعر کے لیے ضروری قرار دیا۔ دوسری طرف اُن کے اس تجربۂ حیات کی ترجمانی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے جو ان کی ہم عصریت کے دائرے سے وسعت پا کر آنے والے زمانوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اور اِس طرح اپنے زمانے کے فکر و احساس اور فہم و ادراک کی علامت ہی نہیں بلکہ عہدِ آئندہ کے امکانات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی پیش آمدہ انقلابات کی عکس بین بن جاتی ہے۔ فیض نے اکیسویں صدی کے طلوع سے پہلے ہی رختِ سفر باندھ لیا۔ مگر انھیں یقین تھا کہ انھوں نے جس صبح کی تمنّا کی ہے اس کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں :

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رَگ رَگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہو کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر[۴]

اکیسویں صدی کا آغاز ابھی کل کی بات لگتا ہے مگر اس کل کی بات پر بھی بارہ برس بیت چکے ہیں ۔ اِن دس برسوں میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ پاکستان کے اندر اور عالمی سطح پر جو خونیں حادثات رونما ہوئے ہیں انھیں بیان کرتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ تاریک راہوں میں مارے جانے والوں کی دُکھ بھری کہانیاں بیان کرنے کا یارا نہیں۔ عراق اور افغانستان پر فوج کشی، ڈرون حملے، دہشت گردی، معصوم انسانوں کا قتل، عالمی بساط پر امریکی چال کے مختلف مظاہر ہیں۔ کمزور ملکوں کو اپنا باجگزار بنانے اور وہاں کے عوام پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے یہ ہتھکنڈے انسان حقوق کے دعویداروں کا اصل چہرہ دکھاتے ہیں۔ فیضؔ کو زندگی بھر اِس بات کا شدّت سے احساس رہا۔ وہ جنگ کے خلاف تھے لیکن انھوں نے استعماریت، استحصال پسندوں اور معصوم انسانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں سے جنگ جاری رکھی۔ امن اور آزادی سے محبت کرنے والے فیضؔ کے یہ الفاظ آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں :

''امن اور آزادی بہت حسین اور تاب ناک چیزیں ہیں اور سبھی تصوّر کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصوّر کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی اِن سب خوبیوں کی قاتل ہے۔''[۵]

فیضؔ کا رجائیت پسندانہ لہجہ اور روشن مستقبل پر یقین، ہمیں حوصلہ بھی دیتا ہے۔ وہ رات کی تاریکی کو غازۂ رخسارِ سحر سمجھتے تھے۔ بین الاقوامی لینن امن انعام کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''ساری دنیا کے خزانے انسانی بس میں آ سکتے ہیں تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو، یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے جہاں لامحدود فضائیں اور اَن گنت دنیائیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی۔ اَب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین فارسی شاعر حافظ نے کی تھی:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است[۶]

خوش آئند بات یہ ہے کہ فیضؔ نے جس تبدیلی اور انقلاب کی بات کی ہے وہ تبدیلی اور عالم گیر انقلاب عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے زوال کی صورت میں رونما ہونے کو ہے۔ وہ ظالمانہ نظام، جس نے تیسری دنیا کے ممالک کو اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا۔ اَب خود امریکی عوام کو بھی اس کی خامی کا ادراک ہو گیا ہے کہ اِس نظام میں ترقی صرف سرمایہ دار سے وابستہ ہے۔ جو محنت کش طبقے کا سب سے زیادہ استحصال کرتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے اِس ظالمانہ سرمایہ داری نظام کے خلاف دنیا کے ۹۰ ملکوں کے ۹۵۰ شہروں میں اضطراب انگیز تحرک پیدا ہو رہا ہے جس میں اس استحصالی نظام اور امریکہ کی جنگی پالیسیوں کے خلاف ایک بھرپور انقلاب رونما ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ آمرانہ حکومتوں اور بادشاہتوں کے خلاف عوام کی جدوجہد بھی رنگ لا رہی ہے اور آمروں کا عبرت ناک انجام دنیا کا بچہ بچہ دیکھ رہا ہے۔ اس منظر نامے کو دیکھ کر فیض کی نظم ''ویبقیٰ وجہ ربک'' یاد آتی ہے جس کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے۔

ہم دیکھیں گے — ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے — مسند پہ بٹھائے جائیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے — سب تاج اُچھالے جائیں گے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے — سب تخت گرائے جائیں گے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں — بس نام رہے گا اللہ کا
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے — جو غائب بھی ہے حاضر بھی
ہم محکوموں کے پاؤں تلے — جو منظر بھی ہے ناظر بھی
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑ کے گی — اُٹھے گا اناالحق کا نعرہ
اور اہل حکم کے سر اوپر — جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی — اور راج کرے گی خلقِ خدا
جب ارضِ خدا کے کعبے سے — جو بھی ہوں اور تم بھی ہو
سب بُت اٹھوائے جائیں گے

ارضِ وطن۔۔۔ پاکستان سے فیضؔ کو ایک خاص تعلقِ خاطر تھا۔ وہ زندگی کی آخری سانسوں تک اس کی محبت میں سرشار

رہے۔ وہ یہاں کے بنیادی مسائل، تقاضوں اور اُمنگوں کا بھرپور ادراک رکھتے تھے۔ اُن کے نزدیک وطن عزیز کے تمام مسائل کا حل اس بات میں مضمر تھا کہ اس کے عوام کو ہر قسم کے جبر اور ظلم سے نجات دلا کر انھیں اس کی عظمت اور خوش حالی کا اصل وارث بنایا جائے۔ چناں چہ اس بات کو انھوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد محسوس کر لیا تھا۔ اس حوالے سے اُن کی یہ تحریر ہمارے سیاست دانوں اور حکمرانوں کے لیے قدرِ اوّل کے لائق ہونی چاہیے۔

> ''پاکستان کی سب سے بڑی دولت ہمارے وسیع میدان اور فلک آشنا پہاڑ، ہمارے لہلہاتے ہوئے کھیت، بہتے ہوئے دریا، ہماری مدفون معدنیات یا معلوم دنیوی ذخائر نہیں۔ ہماری سب سے بڑی دولت ہمارے عوام ہیں۔ پاکستان کی عظمت اور خوش حالی کا وارثِ اوّل بھی انھی کو ہونا چاہیے۔ اس لیے ہمیں لازم ہے کہ ہر سیاسی و سماجی یا اقتصادی مسئلہ کو ان ہی شاکر اور بے زبان عوام کی نظر سے دیکھیں۔''[۸]

آج اکیسویں صدی میں پاکستان ہمیشہ کی طرح پھر ایک نازک موڑ پر کھڑا ہے۔ اندرونی اور بیرونی سطح پر خطرناک مسائل نے اس کا راستہ روک رکھا ہے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری اور نثر میں جن مسائل کی نشان دہی کی وہ آج ایک گھمبیر صورت اختیار کر چکے ہیں۔ عوام آج بھی سیاست دانوں کے اوچھے ہتھکنڈوں اور ہوسِ اقتدار کا شکار ہیں۔ فضا میں ایسی گھٹن ہے کہ سانس تک لینا مشکل ہو گیا ہے۔ فیضؔ کو بھی ایسی ہی صورت حال میں اپنی آواز اٹھانا پڑی۔ مشکل حالات میں بھی وہ خاموش نہیں ہوئے اور نہ ہی حالات سے مایوس ہوئے۔

''صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر''

کہہ کر اُمید کی شمع روشن کرتے رہے۔ ہمیں بھی رات کی تاریکی میں اُمید کا دیا جلا کر صبح کا انتظار کرنا چاہیے۔

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم[۹]

حوالہ جات

۱۔ عزیز حامد مدنی، آج بازار میں پابجولاں چلو (فیض احمد فیض، ایک مطالعہ)، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۔۲۲
۲۔ فیض احمد فیض، ابتدائیہ دستِ صبا، نسخہ ہائے وفا، تیسرا ایڈیشن، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۳
۳۔ فیض احمد فیض، ابتدائیہ دستِ صبا، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۰۴
۴۔ فیض احمد فیض، اے دلِ بے تاب ٹھہرا (دستِ صبا)، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۰۸
۵۔ فیض احمد فیض، بین الاقوامی لینن امن انعام کی تقریب سے خطاب، دستِ تہِ سنگ، نسخہ ہائے وفا، ص ۳۰۴
۶۔ ایضاً
۷۔ فیض احمد فیض، ویبقیٰ وجہُ ربکَ۔
۸۔ فیض احمد فیض، روزنامہ امروز، ۴ مارچ ۱۹۴۸ء
۹۔ فیض احمد فیض، طوق و دار کا موسم، دستِ صبا، نسخہ ہائے وفا، ص ۱۲۸